یوسف

زمانۂ نزول وسبب نزول

اس سورے کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بھی زمانۂ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی جب کہ قریش کے لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ نبی ﷺ کو قتل کر دیں یا جلاوطن کریں یا قید کر دیں۔ اُس زمانہ میں بعض کفار مکہ نے (غالباً یہودیوں کے اشارے پر) نبی ﷺ کا امتحان لینے کے لیے آپ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا کیا سبب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ فوراً اُسی وقت یوسف علیہ السلام کا یہ پورا قصہ آپ کی زبان پر جاری کر دیا، بلکہ مزید برآں اس قصے کو قریش کے اُس معاملہ پر چسپاں بھی کر دیا جو وہ برادران یوسف کی طرح آں حضرت ﷺ کے ساتھ کر رہے تھے۔

مقاصد نزول

اس طرح یہ قصہ دو اہم مقاصد کے لیے نازل فرمایا گیا تھا:

ایک یہ کہ محمد ﷺ کی نبوت کا ثبوت، اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بہم پہنچایا جائے۔

دوسرے یہ کہ سرداران قریش کو بتایا جائے کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو یوسف کے بھائیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ مگر جس طرح وہ خدا کی مشیت سے لڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اور آخر کار اُسی بھائی کے قدموں میں آ رہے جس کو انہوں نے کبھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کنویں میں پھینکا تھا، اسی طرح تمہاری زور آزمائی بھی خدائی تدبیر کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور ایک دن تمہیں بھی اپنے اسی بھائی سے رحم و کرم کی بھیک مانگنی پڑے گی جسے آج تم مٹا دینے پر تلے ہوئے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے قصے کو محمد ﷺ اور قریش کے معاملے پر چسپاں کر کے قرآن مجید نے گویا ایک صریح پیش گوئی کر دی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرف بحرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔

مباحث ومسائل

یہ دو پہلو تو اس سورۃ میں مقصدی حیثیت رکھتے ہیں۔ {ان کے علاوہ} قرآن مجید اس پوری داستان میں یہ بات نمایاں کر کے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام {کی دعوت بھی وہی تھی جو} آج محمدؐ دے رہے ہیں۔

پھر وہ ایک طرف حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے کردار اور دوسری طرف برادران یوسف، قافلۂ تجار، عزیزِ مصر، اس کی بیوی، بیگمات مصر اور حکام مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلہ میں رکھ دیتا ہے {تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ} خدا کی بندگی اور حساب آخرت کے یقین سے {پیدا ہونے والے کردار کیسے ہوتے ہیں} اور دنیا پرستی خدا و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر تیار {ہونے والے کرداروں کا کیا حال ہوا کرتا ہے}۔

پھر اس قصے سے قرآن حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے اٹھانا چاہتا ہے ساری دنیا مل کر بھی اس کو نہیں گرا سکتی۔ بلکہ دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے۔

تاریخی وجغرافی حالات

اس قصے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ تاریخی وجغرافی معلومات بھی ناظرین کے پیش نظر رہیں:

بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے، حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے، اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔

فلسطین میں حضرت یعقوبؑ کی جائے قیام حِبرون کی وادی میں تھی۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ زمین سکم (موجودہ نابلس) میں بھی تھی۔

بائیبل کے علماء کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسفؑ کی پیدائش ۱۹۰۶ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی۔ خواب دیکھنے اور پھر کنویں میں پھینکے جانے {کا واقعہ ان کی سترہ برس کی عمر میں پیش آیا}۔ جس کنویں میں وہ پھینکے گئے وہ بائیبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سِکِم کے شمال میں دُوتَن (موجودہ دُثان) کے قریب واقع تھا، اور جس قافلے نے انہیں کنویں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اُردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔

مصر پر اس زمانے میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جن کو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور فلسطین وشام سے مصر جا کر ۲ ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں سلطنت مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسفؑ کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک یہ لوگ مصر پر قابض رہے اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔ اُسی دور کی طرف سورۂ مائدہ، آیت ۲۰ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا ۔ اس کے بعد ہکسوس اقتدار کا تختہ الٹ کر ایک نہایت متعصب قبطی النسل خاندان برسر اقتدار آ گیا اور اس نے بنی اسرائیل پر اُن مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آتا ہے۔

ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو ''فرعون'' کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ ''فرعون'' مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔

حضرت یوسفؑ ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرماں روا ہوئے اور ۸۰ سال تک بلاشرکت غیرے تمام مملکت مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلالیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دِمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس علاقے کا نام جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم اس ملک سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔

آیاتُھا ۱۱۱ (۱۲) سُوْرَۃُ یُوْسُفَ مَکِّیَّۃٌ (۵۳) رُکُوْعَاتُھَا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۱ قف اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ
بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ
لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۳ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ
اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

ا، ل، ر۔ یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن[۱] بنا کر عربی زبان میں تا کہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو[۲] اے نبیؐ، ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو (ان چیزوں سے) تم بالکل ہی بے خبر تھے[۳] یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جان، میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔''

[۱] قرآن مصدر ہے قَرَأَ یَقْرَأُ سے۔ اس کے اصل معنی ہیں ''پڑھنا۔'' مصدر کو کسی چیز کے لیے جب نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس شے کے اندر معنی مصدری بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ پس اس کتاب کا نام ''قرآن'' (پڑھنا) رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عام و خاص سب کے پڑھنے کے لیے ہے اور بکثرت پڑھی جانے والی چیز ہے۔

[۲] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کتاب مخصوص طور پر اہل عرب ہی کے لیے نازل کی گئی ہے۔ بلکہ اس فقرے کا اصل مدعا یہ کہنا ہے کہ ''اے اہل عرب، تمہیں یہ باتیں کسی یونانی یا ایرانی زبان میں تو نہیں سنائی جا رہی ہیں، تمہاری اپنی زبان میں ہیں، لہٰذا تم نہ تو یہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ یہ باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس کتاب میں اعجاز کے جو پہلو ہیں، اس کے کلام الٰہی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، وہ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ رہ جائیں۔''

[۳] کفار مکہ میں سے بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ کا امتحان لینے کے لیے، بلکہ اپنے نزدیک آپ کا بھرم کھولنے کے لیے، غالباً یہودیوں کے اشارے پر، آپ کے سامنے اچانک یہ سوال پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے مصر پہنچنے کا کیا سبب ہوا۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں تاریخ بنی اسرائیل کا یہ باب پیش کرنے سے پہلے تمہیداً یہ فقرہ ارشاد ہوا ہے کہ اے محمدؐ، تم ان واقعات سے بے خبر تھے، دراصل یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعہ سے تمہیں ان کی خبر دے رہے ہیں۔ بہ ظاہر اس فقرے میں خطاب نبی ﷺ سے ہے، لیکن اصل میں روئے سخن ان مخالفین کی طرف ہے جن کو یقین نہ تھا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ
كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵ وَكَذٰلِكَ
يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ
نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ
مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶ لَقَدْ ع ۱۱

جواب میں اس کے باپ نے کہا، ”بیٹا، اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے،[۴] حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب کرے گا۔[۵] اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا[۶] اور تیرے اوپر اور آل یعقوبؑ پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے، یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔“ ع [۷]

[۴] حضرت یوسفؑ کے دس بھائی جو دوسری ماؤں سے تھے۔ اور ایک ان سے چھوٹا ان کا سگا بھائی تھا یہاں وہی دس بھائی مراد ہیں جو دوسری ماؤں سے تھے۔ حضرت یعقوبؑ کو معلوم تھا کہ یہ سوتیلے بھائی یوسفؑ سے حسد رکھتے ہیں اور اخلاق کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں ہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی ناروا کارروائی کرنے میں انھیں کوئی تأمل ہو، اس لیے انہوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرما دیا کہ اس سے ہوشیار رہنا۔ خواب کا صاف مطلب یہ تھا کہ سورج سے مراد حضرت یعقوبؑ، چاند سے مراد ان کی بیوی (حضرت یوسفؑ کی سوتیلی والدہ) اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں۔

[۵] یعنی نبوت عطا کرے گا۔

[۶] اصل میں ”تَاوِيْلُ الْاَحَادِيْثِ“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا مطلب محض تعبیر خواب کا علم نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے معاملہ فہمی اور حقیقت رسی کی تعلیم دے گا اور وہ بصیرت تجھ کو عطا کرے گا جس سے تو ہر معاملہ کی گہرائی میں اترنے اور اس کی تہ کو پا لینے کے قابل ہو جائے گا۔

[۷] بائیبل اور تلمود کا بیان قرآن کے اس بیان سے مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے خواب سن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا، اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے نہ کہ بائیبل اور تلمود کا۔ حضرت یوسفؑ نے خواب بیان کیا تھا، کوئی اپنی تمنا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس کی جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب ہی سمجھ کر نکالی تھی، تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ یوسف علیہ السلام کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت ان کو یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر برا مانے اور خواب دیکھنے والے کو الٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی بیٹے کے آئندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے الٹا جل بھن جائے؟

كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۷ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ
وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنِ ۝۸ ۚۖ اِقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ
اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝۹ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ
لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ

حقیقت یہ ہے کہ یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا ''یہ یوسفؑ اور اس کا بھائی[۸] دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔[۹] چلو یوسفؑ کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تا کہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔''[۱۰] اس پر ان میں سے ایک بولا ''یوسفؑ کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔''

[۸] اس سے مراد حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یمین ہیں جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوبؑ ان دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی ساری اولاد میں صرف ایک حضرت یوسفؑ ہی ایسے تھے جن کے اندر ان کو آثار رشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اوپر حضرت یوسفؑ کا خواب سن کر انہوں نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا اندازہ بھی آگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے۔ پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بائیبل میں برادران یوسف کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے الٹا الزام حضرت یوسفؑ پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ بھائیوں کی چغلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔

[۹] اس فقرے کی روح سمجھنے کے لیے بدویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں کوئی ریاست موجود نہیں ہوتی اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں، وہاں ایک شخص کی قوت کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی بھتیجے بہت سے ہوں جو وقت آنے پر اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی بہ نسبت فطری طور پر آدمی کو وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں جو دشمنوں کے مقابلہ میں کام آ سکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بھائیوں نے کہا کہ ہمارے والد بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں۔ ہم جوان بیٹوں کا جتھا، جو برے وقت پر ان کے کام آ سکتا ہے، ان کو اتنا عزیز نہیں ہے جتنے یہ چھوٹے چھوٹے بچے جو ان کے کسی کام نہیں آ سکتے بلکہ الٹے خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

[۱۰] یہ فقرہ اُن لوگوں کے نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو خواہشات نفس کے حوالے کر دینے کے ساتھ

السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى
يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ
وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا
لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾
فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ
وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

اس قرارداد پر انہوں نے جا کر اپنے باپ سے کہا ”ابا جان، کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسا نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں؟ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے، کچھ چر چگ[۱۰الف] لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں[۱۱]۔ باپ نے کہا ”تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جب کہ تم اس سے غافل ہو۔“ انہوں نے جواب دیا ”اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیے نے کھالیا، جب کہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے۔“ اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں، تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ ”ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔“[۱۲]

ایمان اور نیکی سے بھی کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نفس ان سے برے کام کا تقاضا کرتا ہے تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کر کے پہلے نفس کا تقاضا پورا کرنے پر تل جاتے ہیں، اور جب ضمیر اندر سے چٹکیاں لیتا ہے تو اسے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر یہ ناگزیر گناہ، جس سے ہمارا کام اٹکا ہوا ہے، کر گزرنے دے، پھر ان شاء اللہ ہم توبہ کر کے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

[۱۰ الف] اردو محاورے میں بچہ اگر جنگل میں چل پھر کر کچھ پھل توڑتا اور کھاتا پھرے تو اس کے لیے پیار کے انداز میں یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

[۱۱] یہ بیان بھی بائیبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کی روایت یہ ہے کہ برادران یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سکم کی طرف گئے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے خود حضرت یعقوبؑ نے ان کی تلاش میں حضرت یوسفؑ کو بھیجا تھا۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے حسد کا حال جاننے کے باوجود انھیں آپ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں بھیجا ہو۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

[۱۲] متن میں وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ کے الفاظ کچھ ایسے انداز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ
وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ
الثلثة بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ
كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ
وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا

شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا ''ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آ کر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔'' اور وہ یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا'' بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا، صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا،[۱۳] جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔''[۱۴] ادھر ایک قافلہ آیا اور اُس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے

معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسفؑ کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس پر وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں ان کی یہ حرکت انھیں جتائے گا جہاں تیرے ہونے کا انھیں وہم و گمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے بوجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائیبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کنویں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انہوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو آگے چل کر تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے والا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنویں میں پھینک رہے ہیں اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا ایسے موقع پر کرے گا۔

[۱۳] متن میں ''صَبْرٌ جَمِيْلٌ'' کے الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ ''اچھا صبر'' ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو، فریاد نہ ہو، جزع فزع نہ ہو، ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیا جائے جو ایک عالی ظرف انسان پر آ پڑی ہو۔

[۱۴] بائیبل اور تلمود یہاں حضرت یعقوبؑ کے تاثر کا نقشہ بھی کچھ ایسا کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائیبل کا بیان یہ ہے کہ ''تب یعقوبؑ نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔'' اور تلمود کا بیان ہے کہ ''یعقوب بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا، پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں یہ میرے بیٹے ہی کا قمیص ہے... اور وہ سالہا سال تک یوسفؑ کا ماتم کرتا رہا۔'' اس نقشے میں حضرت یعقوبؑ وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس سے ہمارے سامنے ایک

وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ
بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ
بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۴ ۱۲
وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ

بھیجا۔ سقے نے جو کنویں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ کر) پکار اٹھا ''مبارک ہو یہاں تو ایک لڑکا ہے۔'' ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا، حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انہوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا[۱۵] اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔ ع مصر کے جس شخص نے اسے خریدا[۱۶] اس نے اپنی بیوی[۱۷] سے کہا ''اس کو اچھی طرح رکھنا

ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ بردبار و باوقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے، اور پھر عالی ظرف انسانوں کی طرح صبر کرتا ہے اور خدا پر بھروسا کرتا ہے۔

[۱۵] اس معاملہ کی سادہ صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے۔ بعد میں قافلے والوں نے آ کر ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ مگر بائیبل کا بیان {اس سے مختلف ہے اور اس میں تضاد بھی پایا جاتا ہے}۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۳۷۔ آیت ۲۵ تا ۲۸ و آیت ۳۶۔ لطف یہ ہے کہ تلمود کا بیان بائیبل کے بیان سے بھی مختلف ہے۔

[۱۶] بائیبل میں اس شخص کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ قرآن مجید آگے چل کر اسے ''عزیز'' کے لقب سے یاد کرتا ہے، اور پھر ایک دوسرے موقع پر یہی لقب حضرت یوسفؑ کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بہت بڑا عہدہ دار یا صاحب منصب تھا، کیونکہ ''عزیز'' کے معنی ایسے با اقتدار شخص کے ہیں جس کی مزاحمت نہ کی جا سکتی ہو۔ بائیبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ شاہی جلوداروں (باڈی گارڈ) کا افسر تھا، اور ابن جریرؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہی خزانے کا افسر تھا۔

[۱۷] تلمود میں اس عورت کا نام زلیخا (Zelicha) لکھا ہے اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا۔ مگر یہ جو ہمارے ہاں عام شہرت ہے کہ بعد میں اس عورت سے حضرت یوسفؑ کا نکاح ہوا، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، نہ قرآن میں اور نہ اسرائیلی تاریخ میں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بدچلنی کا اس کو ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہو۔ قرآن مجید میں یہ قاعدۂ کلیہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ''بری عورتیں برے مردوں کے لیے ہیں اور برے مرد بری عورتوں کے لیے۔ اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔''